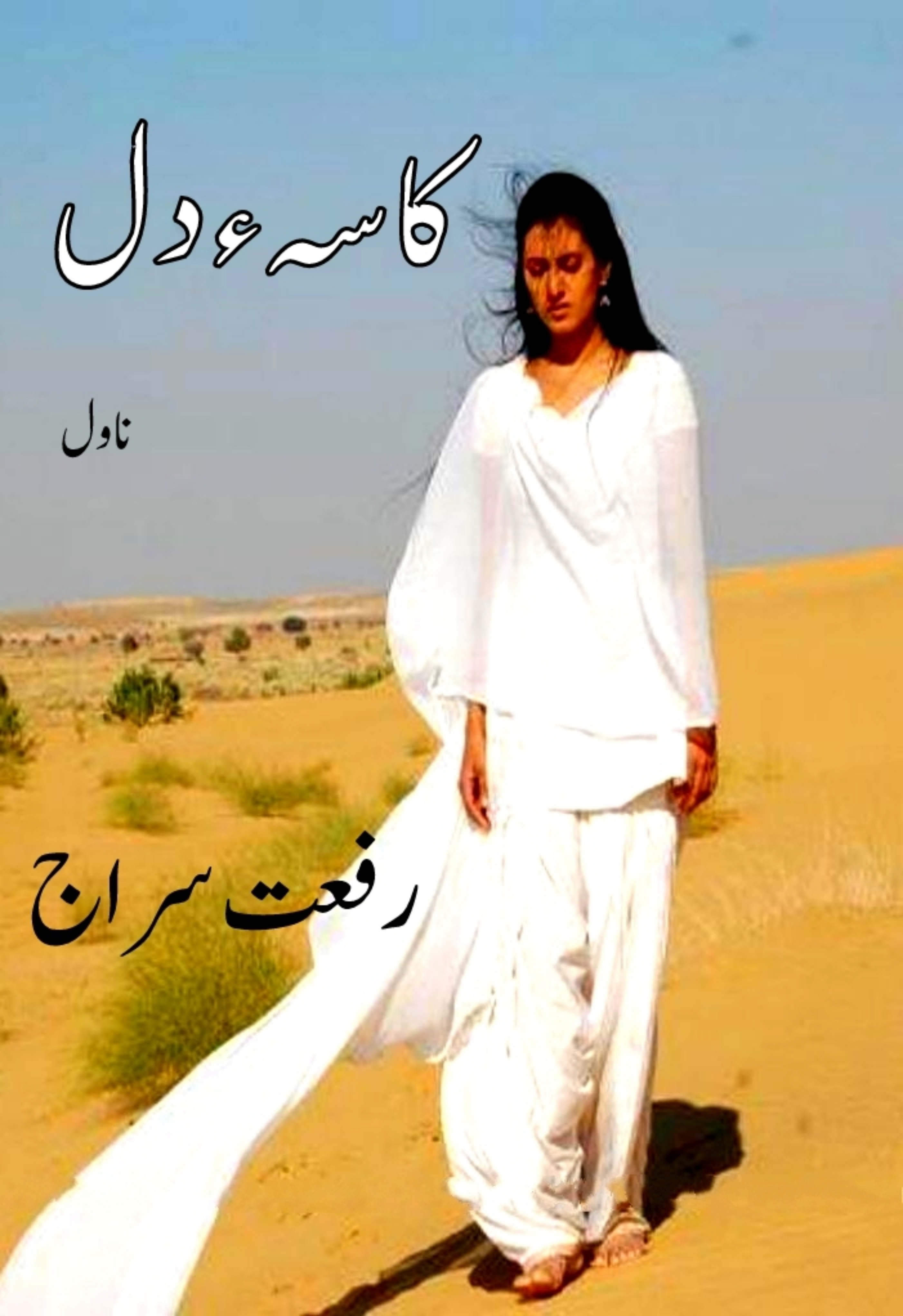
کاسۂ دل
ناول
رفعت سراج

# کاسہء دل

ناول

از

رفعت سراج

جس طرح اندھوں میں کانا، راجا یا سردار کی حیثیت رکھتا ہے، بالکل اسی طرح اس محلے میں مولوی صاحب کی حیثیت تھی۔

مٹھی بھر داڑھی، پنج وقتہ نمازی اور صحاح ستہ کے نام ازبر ہونے کی بنا پر انہیں مولوی صاحب کے ٹائٹل یا خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ وہ امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اور انہیں محلے کے محکمہ قضا میں چیف جسٹس کی معتبر نشست بھی حاصل تھی۔ یعنی مولوی صاحب کی مصروفیات اس ملک کے کسی بھی بڑے آدمی سے کسی طور کم نہ تھیں۔

شیخ معین الدین کے مکان میں انسانوں کا ایک انبوہ موجود تھا اور شور میں کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی سوا اس کے کہ مولوی صاحب کب آئیں گے؟ باہر کھڑے ہو متعدد افراد بات کی تہ تک پہنچنے کے لیے از حد بےچین تھے اور یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ خصوصی عدالت کا وقت کیا ہے؟

پتا نہیں مولوی صاحب کہاں رہ گئے۔ وہ عصر کے فرض پڑھا کر نکلے تھے پھر جانے کس طرف چلے گئے، اب مغرب کی نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ کسی نمازی نے مقدور بھر معلومات تشویش کے لفافے میں بند کر کے آگے بڑھائیں۔

اے بیٹی خدا کے لیے روؤ مت۔ مولوی صاحب آتے ہوں گے، وہی طے کریں گے کہ تمہارے لیے کیا کیا جا؟ اے ہے، کیا اندھیر ہے، ظالم لوگ کنواری لڑکی کو دھکے دے کر یوں باہر نکال دیتے ہیں۔ ایمان تو دلوں سے اٹھ گیا ہے۔ خوف خدا بھی نہیں رہا۔ کسی بوڑھی عورت نے حالات حاضرہ کی تصویر کشی کرنا ضروری خیال کیا۔

اسی وقت اذان مغرب شروع ہوئی۔ نمازیوں نے مسجد کی سمت قدم بڑھا دیے۔ مسجد میں مولوی صاحب پہنچ چکے تھے۔ لوگوں نے انہیں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ نماز ختم ہونے تک تو یہ واقعہ نمازیوں کے سینوں میں بند رہا لیکن نماز تمام ہونے پر لوگوں نے مولوی صاحب کو گھیر کر آج کی تازہ خبر سنا دی۔

شیخ معین الدین کی بیٹھک میں بیٹھے حد درجہ باحیا مولوی صاحب محترمہ سے ضروری سوال کر رہے تھے۔ محترمہ بیٹھک کے دروازے کی اوٹ میں؟؟؟؟؟؟ اور خواتین کے ہمراہ تشریف فرما تھیں۔

بی بی یہ درست، مان لیا اکثر سوتیلی مائیں اسی رویے کے سبب بدنام ہو جاتی ہیں۔ لیکن تم نے بھی گھر چھوڑ کر سخت غیر عاقلانہ فیصلہ کیا ہے۔ وہ بولے۔

مولوی صاحب گھر میں نے نہیں چھوڑا۔ مجھے دھکے مار کر نکالا گیا ہے۔ آواز پر سسکیاں غالب تھیں۔ میری سوتیلی ماں کا سلوک تو میرے والد کی زندگی ہی میں اچھا نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے اپنی خدمت سے ان کا دل جیتنے کی بہت کوشش کی تھی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد تو انہوں نے میرا جینا دوبھر کر دیا اور آج صبح ہی سے وہ میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔ دوپہر کو انہوں نے مجھے مار کر اور یہ کہہ کر نکال دیا کہ آئندہ اپنی منحوس صورت انہیں نہ دکھاؤں۔ ہچکیوں

urdunovels.net

اور سسکیوں کے درمیان بتایا گیا۔

آہ۔ ہائے کئی ٹھنڈی آہوں نے پنکھے کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی۔

لیکن بی بی تمہیں انجان راستوں پر چلنے کے بجائے اپنے کسی رشتے دار کے ہاں چلے جانا چاہیے تھا۔ وہ فطری سادگی و شائستگی سے گویا ہو۔

میرا کوئی رشتے دار نہیں۔ پاکستان بننے کے بعد تمام خاندان میں سے صرف میرے والد نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ چار بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ میرے والد بتایا کرتے تھے کہ ان کے تمام خوشحال رشتے داروں نے آزادی سے زیادہ اپنی جائدادوں اور چلتے کاروبار کو اہم سمجھا تھا۔ میرا اس ملک میں کوئی رشتے دار نہیں۔

یہ سن کر رقیق القلب خواتین کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

بات یہ ہے بی بی کہ آج کا زمانہ بہت خطرناک ہے۔ لوگ کیا ہوتے ہیں مگر کیا بن کر ملتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ ہم اہل محلہ تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟ اگر تم پسند کرو تو ہمیں سوتیلی ماں سے ملواؤ۔ ہم انہیں سمجھانے کی کوشش کریں گے۔

خدا کے لئے مجھے اس عذاب میں دوبارہ ڈالنے کا سوچیے گا بھی نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ میں سمندر میں کود کر جان دے دوں۔ وہ خوفزدہ انداز میں بولی۔

معاذ اللہ مولوی صاحب کا معصوم دل کانپ کر رہ گیا۔ اس ممکنہ اعلان خودکشی پر چند لمحے انہیں اپنا دل سنبھالنے میں لگ گئے۔

تو پھر بتاؤ تم نے اس کچی بستی میں پناہ لینے کا ارادہ کیا سوچ کر کیا؟ ہم غریب لوگ ہیں یہاں کوٹھیاں ہمارے پاس نہیں کہ ہمیں گھریلو ملازمین کی ضرورت پیش آ۔ جیسا کہ شیخ صاحب نے بتایا کہ تم گھریلو ملازمہ کے طور پر کام کرنے کی خواہش مند ہو۔ یہاں تو ان بیچاروں کو اپنے پیٹ کی فکر سے ہی فراغت نہیں۔ تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟ مولانا صاحب لڑکی کی ٹھہری ہوئی آواز آئی۔ اگر اس محلے میں کوئی ایسا گھر ہے جس میں بوڑھے میاں بیوی رہتے ہوں تو میں ان کی خدمت کر کے خوشی محسوس کروں گی۔

دو بہوؤں کی ساس کو یکدم اپنا بڑھاپا اور اولاد کی بے توجہی یاد آ گئی جو اسے چھوڑ کر جا چکی تھیں اس نے جھٹ خود کو پیش کر دیا۔

کچی آبادی کے ان سیدھے سادھے لوگوں کو مزدوریوں اور بیماریوں سے لمحے بھر کی فراغت نہیں تھی۔ انہوں نے جیسے جہالت کے اندھیروں سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ ان کے بچے البتہ پڑھ رہے تھے مگر وہ بھی جبرا۔ نہ انہیں تحقیق کے انداز آتے تھے۔ نا انسانوں کی سمجھ بوجھ تھی۔ ان ھمدرد، غمگسار اور محنت کش لوگوں میں صرف ایک مولوی صاحب ہی تھے جو پرائمری اسکول میں سینئر استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بستی کی ہمہ صفت اور قابل احترام شخصیت تھے، انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔

بی بی تم اس بوڑھی خاتون کے پاس رہ سکتی ہو لیکن سراسر اپنی ذمہ داری پر۔ اس شہر میں بے سہارا عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کئی مراکز بھی ہیں۔ اگر تمہارا ارادہ ہو تو ظاہر کر دینا، میں تمہاری

urdunovels.net

مدد کرکے انسانیت کے ناطے، بہت خوشی محسوس کروں گا۔

عدالت برخواست ہوگئی، اہل محلہ کے لیے اس نووارد لڑکی کا وجود کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ وہ ہنرمند تھی، ان کے اچھے اچھے کپڑے سی دیا کرتی۔ انتہائی کم قیمت کپڑے استعمال کرنے والوں کے ملبوسات کی ایسی ڈیزائنگ کرتی کہ انہیں بھی اچھا لباس میسر آجاتا۔ اسکول جانے والے بچے شام کو اس کے پاس پڑھنے چلے جاتے۔ بڑی بی کے اجاڑ گھر میں خوب رونق لگی رہتی۔ خوبصورتی وحسن تو بجا خود روشنی ہوتا ہے۔ اس ظعیفہ کے گھر کے درو دیوار جگر جگر کرنے لگے تھے اور بوڑھے ناتواں وجود کو آرام بھی میسر آگیا تھا۔

وہ لڑکی اپنا تعارف پہلی ہی ملاقات میں کرا چکی تھی۔ اب لوگوں کے پاس کھوجنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ جب کبھی کوئی خاتون بات کرنا چاہتی تو سوتیلی ماں کا حوالہ خوب تھا۔ عموماً محلے کی خواتین اس کی سوتیلی ماں کے ذکر سے گفتگو کا آغاز کرتیں یا پھر ہندوستان میں مقیم اس کے رشتیداروں کے جنموں میں کیڑے ڈالتیں۔ جنھوں نے پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔

اس کے ہاتھ میں بلا کا ذائقہ تھا۔ عام اور سادہ سا کھانا بھی بہت مزیدار محسوس ہوتا تھا۔ اب محلے کی بزرگ خواتین وحضرات کو ایک سوچ مستقل لگی تھی کہ اس بے سہارا لڑکی کا گھر آباد کردیا جا۔ انہوں نے اس کے لیے بر ڈھونڈنا چاہا تو وہ اتنی مصفا اور پاکیزہ نظر آئی کہ اس کے سامنے محلے کا ہر شخص گندا اور جاہل نظر آنے لگا۔ محلے کی خواتین ایسی سگھڑ، سیانی کیساتھ کوئی ظلم یا ناانصافی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے گئے، آخر کار نظر تھک کر مولوی صاحب پر آٹھہری، مضبوط کاٹھی کے سیاہ داڑھی والے، انکساروحیا کے سبب گردن جھکا کر چلنے والے۔ جب محلے کے سب سے معمر اور سب سے ناخواندہ شخص کے ذریعے ان تک یہ بات پہنچی تو وہ نہایت حلیم انداز میں گویا ہو۔

میاں صاحب ان کے لیے خدا کوئی اچھا بندوبست ضرور کرے گا انشااللہ۔ مین ان کے لائق نہیں ہوں۔ وہ بہت کم عمر ہیں، پینتیس، اڑتیس سان کے مولوی صاحب نے واضح انکار کردیا۔ حالانکہ انہیں باور کرایا گیا تھا کہ لڑکی کو چنداں اعتراض نہیں ہے مگر کسی کی ہمت نہیں تھی کہ وہ مولوی صاحب سے اصرار کرسکتا۔ ناچار لوگ چپ ہوگئے۔

ہر جمعرات کو لوگ کوئی میٹھی چیز پکوا کر مولوی صاحب کے حضور پیش کیا کرتے۔ یہ عمل مولوی صاحب کو پسند نہیں تھا۔ مگر انہیں ناچار سادگی کے مارے عقیدت مندوں کا دل رکھنا ہی پڑجاتا۔ بڑی بی ہر جمعرات کو گوشت پکاتی تھیں۔ اور مولوی صاحب کو کھانا ضرور بھجواتی تھیں۔

جبکہ مولوی صاحب نے بارہا انہیں اس نیک عمل سے باز رکھنا چاہا۔ مولوی صاحب کے ذمے اس محلے کے ور بھی بہت سے کام تھے، کسی کے گھر ختم، نیاز ہے تو مولوی صاحب کی ذمہ داری۔ کسی کے بچے کو نظر لگ جانے کا شبہ ہوا تو وہ دوڑا ہوا چلا آیا۔ دم کرانے۔ کسی کے چکر رکنے کا نام نہیں لے رہے تو پانی پڑھ کردینا مولوی صاحب کا کام۔

شاید کھانے پینے کی اشیاء انہیں بطور اعزاز پیش کی جاتی تھیں جو انہیں محجوب کرتی تھیں۔ آسودہ نہیں مگر یہ ناخواندہ لوگ مقابل کی انا کا ادراک نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ سب مولوی

صاحب کا حق تھا۔

آج جمعرات تھی۔ بڑی بی نے ہفت روزہ گوشت پکایا تھا۔ بلکہ کلثوم نے پکایا تھا۔ اس نووارد لڑکی نے اپنا نام ام کلثوم بتایا تھا لیکن اہل محلہ اسے صرف کلثوم کہتے تھے۔ بڑی بی کو کل رات سے بخار تھا لہذا وہ بڑی بی کی اجازت سے مولوی صاحب کے ہاں خود کھانا لے کر آئی تھی۔ اس نے بوسیدہ چوبی دروازے پر پڑی زنجیر ہلائی تو لمحاتی توقف کے بعد مولوی صاحب آ موجود ہو گر ملگجی چادر میں لپٹی کلثوم کو دیکھ کر تھوڑا سا گھبرا اور دروازے کی اوٹ میں ہو گئے۔

جی بی بی فرمائیے۔ بلا کا شائستہ لہجہ تھا۔

کلثوم تو آخر کار لڑکی تھی، مردانہ حجاب پر الٹی شرمندہ ہو گئی۔ کھانا لائی تھی مولوی صاحب

آپ نے کیوں زحمت کی؟ امید ہے آئندہ آپ۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ٹرے تھامی اور دروازہ بند کر لیا۔ کلثوم الٹے پاؤں واپس ہو گئی۔

مولوی صاحب کے بچے کھچے اہل خانہ کسی دور افتادہ گاؤں میں بستے تھے۔ کبھی کبھار ان کے بڑے بھائی اور بھابی آ جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب اپنی سرکاری ملازمت کے باعث اس شہر کی اس کم مایہ کچی بستی میں رہنے پر مجبور تھے۔ ان کا اسکول بھی یہاں سے نزدیک تھا۔ وہ اس بستی میں اپنی رہائش پر مطمئن تھے۔ آج کل پھر ان کے بھائی، بھابی بطور مہمان ان کے ہاں آ ہو تھے۔ اس مرتبہ مولوی صاحب کی بھابی، مولوی صاحب کی شادی پر سخت مصر تھیں کہ وہ اب ان کا نکاح پڑھوا کر ہی جائیں گی۔ اہل محلہ ان کے اس مشن پر مسرور تھے اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کر رہے تھے۔

جب اہل محلہ نے بھاوج کی توجہ کلثوم کی سمت مبذول کرا کر یہ بتایا کہ وہ رشتا اپنے طور پر مولوی صاحب کے سامنے پیش کر چکے ہیں لیکن اس مرتبہ انہوں نے نکاح سے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی ہے کہ لڑکی بہت کم عمر ہے۔ مولوی صاحب کی بھاوج اللہ کی ایسی شاندار نعمت سے منہ موڑنے پر اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں۔ اور نئے سرے سے ان کے پیچھے پڑ گئیں کہ لڑکی تو تمہارے ساتھ نکاح پڑھانے پر راضی ہے۔ اس پر کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا ہے اور بالآخر انہوں نے اس مرتبہ یہ مہم سر کر ہی لی۔

نکاح سادگی سے ہوا۔ چھوہارے اور شربت سے مہمانوں کی تواضع ہوئی اور مولوی صاحب کا مکان گھر بن گیا۔

اس دن کلثوم رو رو کر تین مرتبہ بیہوش ہوئی تھی۔ اس کا اس طرح بے حال ہونا سمجھ سے بالاتر تھا۔ روتے روتے اس نے کئی مرتبہ ذیان بھی بکا تھا۔ عورتیں آخر کار یہی سمجھیں کہ اس اہم موقع پر اسے اپنے یاد آ رہے ہیں۔

اس کے حافظے میں گزرے وقت کا لمحہ لمحہ روشن تھا۔ اسے یاد تھا کہ بچپن سے لے کر آج تک کبھی ایسی خوش بخت گھڑی نہیں آئی تھی، جس میں انہوں نے یعنی کلثوم کے بھائیوں نے اور استانی بی کے اکلوتے لیکن لیپا پالک بچے نے ایک دوسرے کو دوستانہ نظروں سے دیکھا ہو۔

اسے یاد تھا کہ جب اس کے بھائی زمانہ طفل میں تھے۔ اس لے پالک کے ساتھ یادگار

لڑائیاں لڑی گئی تھیں۔ یادگار اس لیے کہ ہر لڑائی کے بعد کسی نہ کسی کے وجود یا چہرے پر زخم کا نشان ضرور لگا تھا جس نے اس لڑائی کو یادگار بنا دیا تھا۔

اس زمانے میں وہ بہت ہی معصوم تھی، منصفانہ حس سے یکسر بے بہرہ لیکن جب ہوش کی دنیا اس پر روشن ہونا شروع ہوئی تو اسے یہ اندازہ لگانے میں قطعی دشواری پیش نہ آئی کہ دراصل اس کے بھائیوں کے وجود میں خون کی جگہ شرارت دوڑتی ہے اس لیے کہ وہ خود بھی بارہا ان کی شرارتوں کی زد میں آئی اور بری طرح آئی۔ اس کے بھائیوں کو خواہ مخواہ اس کی اکلوتی گڑیا سے بہت زیادہ چڑ تھی۔ بیچاری کی ٹانگ توڑ کر جب تک اسے اپاہج نہ بنا دیتے۔ انہیں چین ہی نہ آتا۔ کبھی وہ اس کے پسندیدہ کپڑے چھپا دیتے۔ اور کبھی آتے جاتے اس کے چٹکی لینا بہت ضروری سمجھتے، اپنے بھائیوں کی ان حرکتوں سے وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ محلے بھر سے لڑائی کٹائی کی جو خبریں آتی ہیں، ان کا نقطہ آغاز اس کے دونوں بھائیوں کی ؟؟؟؟؟ ہوتی ہے۔

اس نے بلا کی غیر جانبدار طبیعت پائی تھی ؟؟؟؟ بھائیوں کی سرانگیزیاں اور سونے پر سہاگا، ماں کی حمایت اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ مگر تب وہ بہت چھوٹی تھی کون اس کی سنتا؟ پہلی بار اس نے تب احتجاج کیا تھا جب اس کے بھائیوں نے اسے استانی جی کے ہاں سیپارہ پڑھنے سے روکا اور ماں سے کہا کہ وہ اس کے لیے گھر پر ہی کسی قاری یہ، قاری یا حافظ کا انتظام کر دیں گے۔ تب اسے بری طرح غصہ آ گیا تھا۔ استانی جی کا گھر کون سا دور ہے؟ دیوار سے دیوار ملی ہے اس کی ساری سہیلیاں وہیں قرآن مجید پڑھتی ہیں۔ گاہے گاہے اٹھ کر استانی جی کے کام کرتی ہیں اور جان بوجھ کر دیر سے کرتی ہیں۔ ٹھٹھے لگاتی ہیں۔ گرمیوں میں استانی جی چھت پر کچے آم، ہلدی نمک لگا کر سکھانے کو ڈالتی ہیں تو وہ کپڑے اتارنے کے بہانے اوپر جاتی اور دو چار ہلدی نمک لگی کچی بھانکیں ہضم کرتی ہیں بعد کو استانی جی سوچتی رہ جاتی ہیں کہ اس مرتبہ دس سیر آم بہت ہی سوکھ گئے۔ پار سال بھی اتنے ہی آموں کا اچار ڈالا تھا مگر وہ تو اتنے نہیں سوکھے تھے۔

اب اس کے بھائی اس سے زندگی کی یہ خوبصورت رونق چھین لینا چاہتے ہیں۔ ابھی وہ بہت چھوٹی تھی۔ بہت سی بیجا ضدیں بھی اسے جائز ہو جاتی تھیں۔ لہذا اس نے اعلان کر دیا کہ وہ قرآن پڑھے گی تو صرف استانی جی سے ورنہ کسی سے نہیں پڑھے گی۔

ماں کے سمجھانے پر بھائی رضامند تو ہو گئے، مگر اسے گھورا بہت تھا۔ تب اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کے منہ بسور کر کہا تھا۔

امی آصف بھائی اور چھوٹے بھائی، انعام بھائی سے لڑتے ہیں، میں تو نہیں لڑتی۔ پھر میں کیوں استانی جی کے ہاں نہ جاؤں؟

نہیں نہیں بیٹی تمہیں کیوں منع کریں گے استانی جی کے ہاں جانے سے، وہ تو بہت اچھی اور مہربان عورت ہیں۔ پھر میری بیٹی سے پیار بھی کرتی ہیں۔ آصف، ماجد تو پاگل ہیں، زمانے بھر کے شرارتی۔ ماں کے خیالات سے اسے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ اس کا استانی جی کے ہاں بیخوف وخطر جانا آنا بدستور رہا۔ ہاں تک کہ تیسوں پارے عمر کی گیارہ منزلوں تک آتے آتے اس نے پڑھ ڈالے۔

انعام اللہ یہ نام استانی نے اپنے اس لے پالک بیٹے کا چاہتوں کے ساتھ رکھا تھا۔ بیوگی کی تازہ فصل پر عمر کی درانتی چلا رہی تھیں کہ کسی دور پار کے عزیز نے انہیں اللہ کا یہ انعام پہنچایا تھا۔

انعام اللہ دو ماہ کا تھا۔ جب استانی جی کے بازوؤں میں آیا تھا۔ اور انہوں نے اپنی پسند سے یہ نام رکھا تھا۔ سنا تھا کہ بچے کی ماں زچگی کے چند گھنٹے بعد ہی اسے تنہا چھوڑ گئی تھی مگر استانی جی نے اسے بہت پیار سے پالا تھا۔ بچپن کے برعکس جب وہ آصف اور ماجد کے ساتھ برسرِ پیکار رہتا تھا۔ بڑا ہو کر وہ بہت سلجھا ہوا نکلا تھا۔ بہت کم لوگ یہ بات جانتے تھے۔ کہ وہ جارح نہیں تھا۔ اس کی جنگ ہمیشہ دفاعی ہوتی تھی۔ بے غیرتی و ہیچمیتی اس کی مٹی میں نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے ظلم سہنے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔ اس کا ڈیل ڈول آصف و ماجد دونوں سے مضبوط اور نکلتا ہوا تھا۔

متوسط طبقے کی اس کالونی میں جہاں بھانت بھانت کے لوگ بستے تھے سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ علاوہ ان تینوں کے، یہ آج بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ان کے سینوں میں انتقام کے الاؤ دہکتے رہتے تھے۔

اسکول ایک رہا جہاں سے کئی بار معرکہ رپورٹ گھر آئی۔ پھر ان کا کالج ایک رہا۔ یہ اتفاق تھا کہ وہاں قائم، پارٹی بازی سے ان کے چوبارہ الگ ہوگئے۔ تینوں نے ایک دوسرے کی حریف مخالف پارٹی سے تعلق قائم کیا۔

ان کی دشمنی دیکھ کر اس کے اعصاب شل ہو جاتے اور دل وحشت زدہ، پھر کالج میں پکڑے جانے والے لڑکوں میں آصف کا نام بھی دیکھا گیا تو گھر والوں کو سانپ سونگھ گیا۔ باپ بیچارہ کہاں کہاں خوار نہ ہوا۔ آصف دو دن سرکاری مہمان کیا بنا کہ اس کے تو اطوار ہی بدل گئے۔ اب تو اسے یہ ناز بھی تھا کہ وہ حوالات کی ہوا کھا کر آ چکا ہے۔ آخر پٹھان خون ہے کسی بزدل کا نہیں۔

وہ استانی جی کے ہاں کم جاتی تھی اور انعام سے سامنا بھی کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ مگر وہ اس پر بھی اچٹتی نظر بھی نہیں ڈالتا تھا اس لیے نہیں کہ وہ کم رو تھی بلکہ اس لیے کہ قرآن پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کے شور سے وہ بہت گھبراتا تھا اور زیادہ تر گھر سے باہر ہی وقت گزارتا تھا۔ ایک روز جب وہ کالج سے تھکا ہارا گھر آیا تو قاری بچوں کے بے ترتیب جوتوں، چپلوں سے الجھ کر گرتے گرتے بچا اور بھنا کر رہ گیا۔

اماں جان کم از کم ان بچوں کو جوتے اتارنے اور رکھنے کی تمیز تو سکھا دیں۔

جوتے ہمیشہ اسی جگہ پا جاتے ہیں اور اسی انداز میں۔ یہ خیال آپ کو پہلے کیوں نہیں آیا کہ بچوں نے تمیز سکھانا چاہیے؟ وہ اسے گرتے گرتے سنبھلتا دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھی تھی۔

انعام نے چونک کر اس شرانگیز آواز کی سمت دیکھا۔

تسلیم وہ بولی۔

اس نے غور سے دیکھا جو واقعی سرتاپا تسلیم و نیاز نظر آ رہی تھی۔

اے ہاں یہ تسلیم ہی تو ہے، بڑی سمندر پار سے آئی ہے جو پہچانی نہیں جا رہی۔ ارے یہ تو بہت

چھوٹی سی تھی تب سے آ رہی ہے؟

ماں کے ان جملوں پر اس نے بہ غور اس کے نیاز حاصل کیے۔ دراصل جب سے اس نے قرآن مجید ختم کیا تھا۔ اس کا استانی جی کے ہاں کم ہی آنا ہوتا تھا۔ وہ بھی بہ مشکل کسی بہانے سے، جیسے آج آ گئی تھی۔ کوفتوں کا، ہدیہ لے کر، اور جب وہ آتی تھی تو انعام اسکمل، کالج یا میچ وغیرہ کھیلنے گھر سے باہر ہوتا تھا۔

یہ عجیب لیکن اچھی بات تھی کہ بچوں کی اکثر اوقات کی چپقلش کے باوجود دونوں گھروں کے بڑوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ نارمل تھا۔ جس پر دونوں طرف کے بچے اپنے بڑوں سے نالاں تھے۔ اور چاہتے تھے کہ دونوں گھرانے آپس میں عام سی صاحب سلامت بھی نہ رکھیں۔

انعام، اسے واقعی اللہ کا انعام لگا تھا۔ وہ جو مہینے بھر تک استانی جی کے دروازے کو دور سے تکا کرتی تھی، اکثر استانی جی کے کام کرتی نظر آنے لگی۔ میٹرک کے امتحانات کے بعد فراغت تھی۔ عموماً اپنی سلائی کڑھائی کا سامان لے کر ان کے ہاں آ جاتی اسے خود یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ کیا اسے کچھ اچھا لگا ہے؟ اور بات یہ ہے کہ جو شے اچھی لگتی ہے، بغیر دلیل کے لگتی ہے۔ اچھے لگنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ پہلے چیز بے ساختہ اچھی لگتی ہے پھر انسان اپنے دل سے دلیل طلب کرتا ہے کہ یہ اسے کیوں پسند آئی؟ اور دل، دلیل کا گھر نہیں ہے۔ دلیل کا ٹھکانہ عقل ہے جو کب کی منہ بسور کر، کواڑ پھیر کر بیٹھ چکی ہوتی ہے لہٰذا وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ ادھر وہ بھی انجان نہیں تھا۔ محتاط تھا۔ پارسا تھا اپنے وقار کے لیے بے پناہ حساس تھا۔ اس لیے خاموش تھا۔

نئے سال کے چند ماہ گزرے تھے کہ قدرت نے تسلیم کو یتیمی کے امتحان اور بھائیوں کی حاکمیت کے عذاب میں ڈال دیا تھا۔ اس کے سر سے مضبوط سائبان ہٹ گیا تھا۔ جب ماں ہی ٹوٹی ہوئی نظر آئی تو اس کا کیا سوال۔ وہ تو محض اپنے وجود ہی میں قید ہو کر رہ گئی۔ دل کے چور نے علیحدہ اس کی مشکیں کس دی تھیں۔ اسے بھائیوں کی خونخوار اور سخت نظریں اپنا آپ پڑھتی ہوئی محسوس ہوتیں۔

اور جب وہ ایک عرصے بعد مرحوم کی عزت کا ادراک کر کے استانی جی کے گھر آئی تو وہ اسے سامنے ہی مل گیا۔ بیٹھا جوتوں کے تسمے کس رہا تھا۔ صحن میں بچوں کا مخصوص شور تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا اور مسکرا دیا۔

کہاں تھیں؟

ساری اولوالعزمی یہاں وہاں کہیں بہہ گئی اور اس نے سوچا وہاں جہاں تم آج تک نہیں پہنچے۔ گویا وہ اس کی آمد کو محسوس کرتا رہا ہے، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ اس پر ایک اچٹتی نظر بھی نہیں ڈالتا۔ وہ جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ مگر اس کے چہرے پر بڑا حوصلہ افزا تاثر تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک بار اس نے اتفاق سے ماں کی وہ بات سن لی تھی۔ وہ اس کے بھائیوں سے کہہ رہی تھیں۔ استانی جی تسلیم کو بہت زیادہ پسند کرتی ہیں۔ کئی بار اشارتاً کہہ چکی ہیں کہ وہ اسے اپنی بیٹی بنانا چاہیں گی۔

اوقات دیکھی ہے بڑھیا نے؟ اور کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں اس کے اس زبردستی کے بیٹے میں؟ آصف کا طرز تخاطب اس گھر کے ذکر پر پستیوں کی انتہا کو جا پہنچا تھا۔

اور اگر اس طرم خان نے ایسا سوچا ہوگا تو جان سے مار کر چوک پر لٹکا دوں گا۔ ماجد بولا۔

اس قدر آپے سے نکلنے کی کون سی بات ہے؟ ماں نے جھڑک دیا۔ ایک بات ہو رہی تھی۔ آج بھی کل کے ننھے بچے بنے ہو ہیں۔ توبہ ہے۔ ماں نے مزید لعن طعن جاری رکھی تو وہ ایک نئے کرب سے آشنا ہو گئی ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت نہ ہو اور احساس بےبسی کی انتہا ہو تو خواہش جنون بھی بن جاتی ہے۔ پابندی ازل سے حوا اور آدم کے تجسس اور شوق کو بھڑکاتی آئی ہے۔ اسے خونی رشتے سانپ بن کر ڈسنے لگے تھے۔

تسلیم اب بھی آنکھ بچا کر وہاں ہو آتی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح انجان بن کر ہی ملا۔ جوت جلی اور بجھ بھی گئی۔ تھوڑی سی توجہ کے بعد شدید بے توجہی سے قرار ہی لٹ گیا۔

ایک روز جب استانی جی بخار میں پھنک رہی تھیں اور تسلیم برف کی پٹیاں ان کی پیشانی پر رکھ کر ان کے وجود کی آنچ کم ہو رہی تھی کہ وہ بہت پریشان و بیقرار نظر آیا اور اسے اشارے سے باہر بلایا۔ تسلیم ہمکتے دل کو سنبھالتی جب اس کی بات سننے باہر آئی تو وہ بیدھڑک بولا۔

تسلیم میرا انجان بننا بھی کسی کام نہیں آیا۔ تم بالکل نہیں بدلیں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ سب ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن، براہ مہربانی تم میرے گھر نہ آیا کرو۔ میں امتحان میں پڑ جاتا ہوں۔

تسلیم نے کانپتا دل سنبھالا، اس کی سمت دیکھا اور سوچا، غافل تجھے اتنی دیر میں سوجھی۔ پھر وہ بولنے کی کوشش کرتی رہی مگر آنسوؤں کا سلسلہ نہ تھما اور لفظ اس کے ہونٹوں پر نہ اتر سکے بالآخر وہ بولا۔

آخر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ یا تو یہ کہ کورٹ میرج کر لیں اور بعد میں اعلان کر دیں پھر کیا کر سکیں گے تمہارے بھائی؟ مگر مجھے لگتا ہے پھر بھی تم ہارو گی، اس لیے کہ وہ جلد ہی تمہیں بیوہ کر دیں گے۔ اسے بھی اس کے بھائیوں ہی سے خطرہ تھا۔

کورٹ میرج۔ میرج سے لجانے والی کورٹ میرج کی بات سن کر چکرا سی گئی۔ نن نہیں۔ اتنا کہہ کر وہ واپس استانی جی کے کمرے میں آ گئی اور ان کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ منزل کس قدر قریب تھی اور کس قدر دور بھی۔ پھر وہ بری طرح الجھ کر گھر آ گئی تھی۔

انعام اللہ کو گریجویشن کے بعد محکمہ جنگلات میں سروے آفیسر کی جاب مل گئی تھی۔ اب اسے کسی دوسرے شہر جانا تھا۔ استانی جی اس کے بنا نہیں رہ سکتی تھیں۔ ناچار ہو بھی اس کے ہمراہ جا رہی تھیں۔ محلے کی تین نسلوں نے جدائی کے لمحوں کے کرب سمیٹے تسلیم سکتے کے عالم میں خالی الذہن رہ گئی۔ کس قدر بیدرد تھا وہ گئی تو اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

ماہی بے آب کی طرح تڑپ کر اس نے وداع کے لمحوں کا سامنا کیا اور چلا گیا۔ وہ محض سوچتی رہ گئی کہ اب وہ کیسے رہے گی؟ کیوں کر جیے گی؟ اسے اپنے بھائیوں کی صورت سے وحشت ہونے لگی۔ عورتیں اکثر اس کی ماں کے پاس بیٹھ کر استانی جی کو یاد کیا کرتیں مگر تسلیم صرف اسے، اگر وہ مہندی رنگے بالوں والی خوبصورت بوڑھی عورت کبھی یاد بھی آئی تو اس کے حوالے

ہے۔ سرکتے دنوں نے اچانک اسے تحفے کی صورت اس کی آمد کی اطلاع دے کر کروٹ بدلی۔ پتا چلا، کچھ ضروری سامان لینے آیا ہے جو گھر میں رہ گیا تھا۔ وہ دو دن کے لیے آیا تھا۔ پورا محلّہ اسے گھیرے بیٹھا تھا۔ سب اس سے اپنی استانی جی کے بابت پوچھ رہے تھے۔ مگر اس کے بھائی حسب سابق جل بھن کر خاک ہو رہے تھے۔ آخر رات کو اس نے انعام اللہ کا دروازہ بجایا۔ وہ اسے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا پھر مسکرا دیا۔

کسی نے دیکھا تو نہیں؟

نہیں وہ تیزی سے اندر آ گئی۔

مجھے اپنی فکر نہیں ہے، صرف تمہاری ہے۔ تمہارے بھائی۔

مت کرو ان کا ذکر انہوں نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم کیا ہے۔

ان کی کیا مجال؟ اگر انسان خود ہی نہ چاہے تو؟ وہ نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔

وہ اس کے بہت قریب کھڑا تھا۔ کیا پھر دور ہونے کے لیے؟۔

استانی جی کیا کہیں گی؟ آخر کار اس نے کہا۔

انہیں تمام صورتحال کا علم ہے۔

اگلے روز بلکہ اگلی شب وہ ٹرین کے سلیپر میں بیٹھے، آئندہ پیش آنے والے مراحل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ حیدرآباد اسٹیشن پر وہ تسلیم کو چائے دے کر جو اس نے چھوٹے سے تھرماس میں بھرلی تھی۔ کچھ چیزیں لینے کے لئے نیچے اتر گیا تھا۔ چائے کے آخری گھونٹ نے تسلیم پر

غنودگی طاری کر دی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ تیز چمکتی دھوپ کھڑکی کے راستے اندر آ رہی تھی۔ گاڑی جانے کن بیابانوں کا سینہ چیرتی گزر رہی تھی۔

دور دور تک ویرانی پھیلی ہوئی تھی اور اس کا دل گویا پسلیاں توڑ کر باہر آیا چاہتا تھا۔ اس کے حواس کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا ہے۔

ٹرین کی رفتار کا شور اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی ضربیں بن کر لگ رہا تھا۔ اور ہر ضرب کے ساتھ ایک نیا سوال گونجنے لگتا تھا۔

وہ کہاں ہے؟

وہ کہاں گیا؟

کیا میں اتنی دیر سوتی رہی؟

وہ بمشکل اٹھ کر باتھ روم تک گئی۔ وہ خالی تھا۔ اسے چکر آ گیا۔ انعام اللہ اس نے یوں آہستگی سے پکارا، گویا وہ اس کے دل میں ہو، اور جیسے پکار کا جواب دے گا۔

یہ کیا ہے انعام اللہ

معاً اسے اپنا ہینڈ بیگ یاد آیا جس میں خاصی رقم اور سونے کے دو تین زیور تھے۔ اس نے تیزی سے چادر سیٹ سے کھینچ کر ایک طرف کی۔ ہینڈ بیگ موجود تھا۔ اس نے جلدی سے کھول کر اپنی چیزیں دیکھیں۔ رقم بھی موجود تھی اور زیور بھی ان کے علاوہ خاکی کاغذ کا لفافہ بھی تھا۔ اس نے فوراً کھول کر دیکھا۔ ایک سفید تہہ شدہ خط میں سو سو کے چار نوٹ رکھے تھے۔ وہ جو اس تمام

صورتحال سے انتہائی دلبرداشتہ نظر آرہی تھی، ایک دم مستعدسی ہوگئی، اور خط پڑھنے لگی۔

تسلیم صاحبہ

گاڑی حیدرآباد کے اسٹیشن پر کافی دیر رکتی ہے۔ میں یہاں تمہارے سامنے اتروں گا اور دوسری گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔ تم نے چاپی؟ ذائقہ کیسا لگا؟ یقیناً تمہیں آٹھ گھنٹے کے اندر ہوش آگیا ہوگا۔ تم دوسری گاڑی سکھر واپس چلی جانا میں بس اتنا چاہتا تھا کہ تمہارے بھائی کی گالی کا جواب، تمہارے ذریعے دوں۔ تین سال قبل تمہارے بھائی نے کالج میں بیسیوں لڑکوں کی موجودگی میں مجھ سے کہا تھا۔

نہ جانے کس گندی عورت کا انعام ہے جسے استانی جی نے ترس کھا کر پالا ہے۔ اسے تو اپنے باپ کا نام بھی نہیں معلوم۔

میری حقیقت کیا ہے، مجھے معلوم ہے لیکن تمہارے بھائی نے مجھ سر اٹھا کر چلنے سے روکا تھا۔ بات ہے غیرت کی۔ اگر مجھے گالی سننا آتا ہے تو اسے لوٹانا بھی آتا ہے۔

تم اذیت ضرور اٹھاؤ گی مگر تمہاری ماں زندہ ہے وہ تمہیں مرنے نہیں دے گی کہ تم اس کی اکلوتی بیٹی ہو۔ میں نے تمہارے بھائیوں سے انتقام نہیں لیا۔ بلکہ ان کو اپنے برابر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید یہ سب نہ ہو پاتا اگر تمہاری نظر مہربان نہ ہوتی۔ بہت شکریہ۔

تمہارا اور میرا ایک گلی سے ایک رات اکٹھے غائب رہنا۔ یہی تمہارے بھائیوں کو جواب ہے، ہو سکے تو یہ خط بھی اپنے بھائیوں کو دکھا دینا۔ واپسی کے اخراجات کے لیے کچھ رقم رکھ دی ہے۔

انعام اللہ

محبت کی یہ صورت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی۔ ماں زندہ ہے مگر معزول ملکہ ہے۔ یہ تم نے کیا کیا انعام اللہ؟ اس نے سوچا اتنی بھگدڑ مچی ہوگی۔ ایک زمانہ اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوگا۔ اس کے بھائی اس کا قیمہ کرنے کو بیتاب کھڑے ہوں گے۔ صرف اس کا ہی نہیں بلکہ انعام اللہ کا بھی۔ یہ کیا ہوگیا۔ یہ تم نے کیا کر ڈالا انعام؟ کیسے مرد ہو تم انتہائی پارسا کہ مجھے کبھی چھوا ہی نہیں اور انتہائی۔۔۔ رذیل بھی کہ مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔

اس کی ماں نے اسے بچپن میں ایک کہانی سنائی تھی، جس میں ایک خوفناک اژدھے کا ذکر تھا۔ اس اژدھے کی پھنکاریں اتنی طاقتور تھیں کہ ہزاروں گز کے فاصلے پر کھڑے شخص کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھیں۔ وہ پھنکاریں شاید کسی کینہ پرور کے انتقام کا بھیس ہوں گی جھلسا کر رکھ دینے والے منتقم کا بھیس جو اژدھے کے وجود کو کمین گاہ بنا ہوتے تھے۔

میری خطا کیا تھی انعام؟ محض آصف کی بہن ہونا میرا سب سے بڑا جرم ٹھہرا۔ اس نے خود کلامی کی پھر اس کی تمام حسیں جاگ اٹھیں۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اتنی شدت سے کہ اس پر ناتوانی طاری ہوگئی تھی۔

جہاں گاڑی خالی ہوگئی، وہ بھی اتر گئی۔ اس کا سب کچھ سلامت تھا پھر بھی وہ سرتاپا لٹ چکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کراچی جانے والی ایک ٹرین میں بیٹھ گئی۔ اس کی قوت فیصلہ اب بھی مفلوج تھی۔

اس کا ذہن بس ایک خیال پر دستک دیے جا رہا تھا کہ کسی اور کا ذہن کسی نقطے پر ٹھہرا ہوا یا نہ ٹھہرا ہو مگر اس کے گھر والے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں گے کہ وہ انعام کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔ وہ کیوں کر یقین دلا پاتی کہ اس کا کچھ۔

جب وہ کراچی کینٹ پر ہینڈ بیگ سنبھال کر اتری تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ خیالات کی یلغار اب اس کے ذہن پر حملہ آور تھی۔ وہ کیوں اور کس منہ سے اس گھر میں جاتی جس کا ایک ایک چراغ چکنا چور کرنے کے بعد وہ تاریکی اوڑھ لپیٹ کر باہر نکلی تھی۔ اس نے چشم تصور سے اپنے گھر کی دہلیز پر اپنے وجود کے ٹکڑے خون میں لت پت بکھرے دیکھے کہ اس کے ذہن کو اپنے غیرت مند بھائیوں کے مزاج کا ادراک تھا۔ پھر اس نے اپنے بھائیوں کے خون آلود ہاتھ ہتھکڑیوں سے بوجھل دیکھے، انہیں قید بامشقت کاٹتے ان کی سفید داڑھیوں کو آنسوؤں سے تر دیکھا۔ اور اسی لمحے اس نے خود اپنی زندگی پر فاتحہ پڑھ لی، سوچ اور سفر دونوں کا رخ بدل دیا اور کچی بستی میں چلی آئی جو بہت ہی پس ماندہ دور افتادہ تھی، وہ جانتی تھی کہ اسے ہر جگہ ڈھونڈا جاتا کہ بے سہارا عورتوں کے مراکز تک میں بھی۔ تسلیم کو اس نے کراچی کینٹ میں دفن کر دیا۔ اور آج وہ ام کلثوم بنی مولوی صاحب کی منکوحہ تھی۔

مولوی صاحب اس بے سہارا، خوبصورت، خوش اطوار بیوی کے بڑے قدر دان تھے، ہمہ وقت اس کی دلجوئی کرتے رہتے خاص طور پر انہیں اس کے ہاتھ کے کھانے بہت پسند تھے۔ وہ اسے بتاتے کہ وہ کہیں بھی کھانا نہیں کھاتے، خواہ کوئی کتنا ہی مجبور کرے کہ وہ اس کے ہاتھ کے پکے کھانے کو بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔

انہیں دنوں بستی میں ایک سانحہ ہوگیا۔ بنن حلوائی کی بیٹی رشیدہ کرم دین رکشا ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کی ماں مولوی صاحب کے پاس اس کی واپسی کے لئے دعا کرانے آئی۔ ام کلثوم نے اس میں اپنی ماں کی تصویر دیکھی تو دل کانپ کر رہ گیا۔

آخر کار بستی والوں کی بھاگ دوڑ کام آئی رشیدہ اور کرم دین بازیاب ہوگئے۔ باہمی مشورے سے دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ اور ساتھ ہی رشیدہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ آج سے اس کا کوئی میکا نہیں۔

یہ سب باتیں کلثوم کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کر گئیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رشیدہ سے ہمدردی کر بیٹھی۔ اپنائیت کے احساس سے اس راندۂ درگاہ کا دل بڑھاتی۔ اس کے کام آتی جس پر بستی والوں کو بھی اعتراض تھا۔ مگر مولوی صاحب کے احترام کی وجہ سے وہ منہ سے کچھ نہ کہتے۔

آج جمعرات تھی۔ رشیدہ منت کی کھیر اس غمگسار کے ہاں لائی تھی جو اس نے مولوی صاحب کو کھانے کے ہمراہ پیش کر دی کیونکہ وہ میٹھے کے بہت شوقین تھے، کھانے کے بعد جب وہ کھیر کھانے لگے تو ایک لمحے کے لیے رک گئے۔

یہ کھیر کس کے گھر سے آئی ہے کلثوم؟

رشیدہ لے کر آئی تھی۔ وہ آہستگی سے بولی۔

لاحول ولاقوۃ انہوں نے پیالہ رکھ دیا۔ میں کسی بھگوڑی کے ہاتھ کا پکا کھانا کھانا کفر سمجھتا ہوں۔
نہ جانے کلثوم کا کلیجہ کیوں کانپا تھا بھائی عقب سے نشانہ باندھے ہوتے، کوئی بات نہیں لیکن مولوی صاحب کے تیر کا رخ اس کے دل کی سمت تھا۔ کھیر کا پیالہ اٹھا کر کمرے میں چلی آئی تا کہ مولوی صاحب اس کی پلکوں پر لرزنے والے آنسو نہ دیکھ سکیں۔

اختتام------------------------ The End

urdunovels.net